دینی مدارس کی اصلاح!

خطیب انقلاب مولانا حسن ظفر نقوی اجتہادی (کراچی)

ان باایمان اور ذمہ دار اساتذہ سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہ جو دیانتداری اور دردمند دل کے ساتھ مستقبل کے علماء کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ باایمان اور باصفا اساتذہ بھی میری اس بات کی تائید کریں گے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس مقدس شعبے میں بھی پروفیشنل ازم (کاروباری انداز) گھس آیا ہے۔

بعض مدارس کا یہ حال ہے کہ یہ یہ کچھ لوگوں کی دکانیں ہیں جہاں قوم و مذہب کی خدمت سے زیادہ اپنے اور اپنے آنے والے بچوں کے لیے ٹھکانہ مقصودِ نظر ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسجد اور مدرسہ کو اپنی میراث سمجھ لیا جاتا ہے۔ پیش امام چاہتا ہے کہ میری اولاد قابل ہو یا نہ ہو مسجد کی امامت میرے پاس یا میرے بچوں کے پاس ہی رہنی چاہیے۔ ہمارے بعض بہترین دینی مراکز صرف اس لیے غیر معیاری ہو گئے کہ بزرگ علما کے جانے کے بعد وہاں نااہل افراد قابض ہو گئے۔

سب سے پہلے مدارس کو ذاتی ملکیت کی قید سے باہر نکالا جائے۔ وہ کیسے ہوگا؟

دراصل سارا جھگڑا ان مفادات کا ہے جو مدرسے کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خمس ہمارے اداروں کی بقا اور ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اسی خمس کا غلط استعمال ہونے لگے تو نہ صرف یہ کہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ غرباء و فقراء بھی بے آسرا رہ جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ابتلا اور مذہب سے دوری کے دور میں بھی اربوں کے حساب سے خمس نکالا جاتا ہے۔ خمس پر چند مولویوں اور چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ مال امام مدارس کی اور اجازہ رکھنے والے مولویوں کی نذر ہو جاتا ہے اور سہم سادات کے مستحق سادات کی ایک فیصد تعداد کو بمشکل ان کا حق پہنچ پاتا ہے۔ خمس لیتے وقت تو ساری زندگی کا حساب آپ سے لیا جاتا ہے۔ آج تک ہمارے ملک میں کسی نے وصول کئے جانے والے خمس کا بھی حساب دیا؟ یہ تو ہر شخص کو کہتے سنا ہے کہ ہمارے پاس فلاں فلاں مراجع عظام کی طرف سے خمس لینے کی اجازت ہے لیکن یہ آواز کہیں سے نہیں آتی کہ مستحق افراد خمس کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

کیوں؟ کیا صرف ایک عام مومن امام کا جواب دہ ہے علماء نہیں؟ یقیناً علماء کی جواب دہی سب سے زیادہ ہے کاغذ کا ایک پرزہ جسے اجازے کا نام دیا گیا ہے اس پر بھی مرجع تقلید یہی لکھتا ہے کہ انتہائی احتیاط سے مربوط امور میں خرچ کرنے کے بعد اپنی معاشی ضرورت کو بھی صاحب اجازہ پورا کر سکتا ہے۔ بس اس ایک آخری جملے نے مصیبت کر دی۔ اب ایک مولوی کی معاشی ضرورت کیا ہے اس کی کوئی حد بندی نہیں ہے یا تو اس کا کوئی نہ کوئی کروڑوں روپے کا پروجیکٹ ہوتا ہے اور پھر اس پروجیکٹ کے بعد اس کی عیال کی معاشی ضروریات، تو پھر اب ظاہر ہے کہ غریب آدمی کہاں جائے، اس کی ضرورت کون پوری

کرے؟ دوسری طرف کچھ علماء اور ذمہ دار مخیر حضرات غربا اور فقرا کی سرپرستی اور امداد کرتے ہیں تو سارا بوجھ بشمول الزامات اور تہمتوں کے ان کے سر پر آ پڑتا ہے۔ اگر اس خمس کے آنے اور جانے دونوں کا حساب ہونے لگے تو یقیناً قوم تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔

لہٰذا اس خمس کو مرکزیت (centralization) حاصل ہونا چاہیے، لینے کا بھی اور دینے کا بھی حساب ہونا چاہیے۔ ضرورت کے مطابق مدرسوں کا قیام ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جہاں دل چاہے، جس کا دل چاہے خمس کی دکان سجا کر اور خمس کا مال سمیٹ کر مدرسہ کھول کر بیٹھ جائے۔ علماء کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق ہوں، تحقیقی مراکز کا قیام ہو جہاں علماء مختلف میدانوں اور موضوعات پر تحقیقاتی خدمات انجام دے سکیں۔ جدید علوم بالخصوص کمپیوٹر، سائنس کے مراکز کا قیام، میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز اور یونیورسٹیز کا قیام، اسپتالوں کا قیام، بیواؤں، یتیموں اور نادار انسانوں کی سرپرستی، قوم کے بچوں کو لازمی طور پر تعلیمی زیور سے آراستہ کرانا، اسیروں کی دیکھ بھال، کون سا مسئلہ ایسا ہے جو ہم خمس کے ذریعے حل نہیں کر سکتے مگر اس کا صحیح استعمال تو ہو۔ میں اس فکر میں تنہا نہیں ہوں بلکہ بعض بزرگ علماء بھی میری اس فکر کی تائید کرتے ہیں۔

بظاہر میری بات نئی اور عجیب لگے گی مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ساری قوم کی آواز ہوگی۔ جس طرح خمس نکلوانے کے لئے لوگوں کو تبلیغ اور ترغیب دی جاتی ہے بالکل اسی طرح خمس وصول کرنے والوں کو بھی پابند کرنا پڑے گا کہ وہ خود ہی سالانہ وصول کئے گئے خمس کا حساب شائع کریں۔ یہی خمس کی غیر منصفانہ تقسیم اداروں اور افراد میں رسہ کشی کا باعث ہی نہیں بن رہی بلکہ درباری ملاؤں کی پیداوار میں مسلسل اضافے کا باعث بھی بن رہی ہے۔ کیونکہ یہی مال وزر علماء کو سرمایہ داروں کے در کا گدا بنا دیتا ہے اور عوام کو علماء کے در کا (عوام کو علماء کے در کا گدا ضرور ہونا چاہیے مگر اس انداز سے نہیں جو مال حاصل کرنے کے لیے اپنایا جاتا ہے)

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس دین کے سچے اور مخلص محافظوں کی پرورش کریں تو ہمیں مدارس کے نظام میں بھی کچھ تبدیلی کرنا ہوگی، تمام مدارس میں ایک درسی نظام قائم کرنا ہوگا۔ مدرسے میں داخلہ لینے والے طلباء کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا، علاقائی ضرورت کے مطابق مدارس قائم کرنے ہوں گے۔ اس مدرسہ کا کوئی مالک نہیں بلکہ منتظم اعلیٰ ہو جس کی مدت مقرر ہونا چاہیے۔ یہ منتظم کا منصب ورثہ میں نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ملنا چاہیے اور اس اہلیت کا فیصلہ علماء کا ایک بورڈ کرے۔ تمام شہروں میں مدارس کے قیام کے بعد کسی ایک شہر میں ایک ''علمی شہر'' جسے یونیورسٹی کہیے یا حوزہ علمیہ کہیے دینی طلاب کی اعلیٰ تعلیم یعنی اجتہاد کے لئے ہونا چاہیے۔

ضروری نہیں کہ سارے طلاب دوسرے ممالک میں پڑھنے کے لئے جائیں اور نہ ہی آج کے دور میں یہ ممکن ہے کہ یہاں کے سارے طلاب کو دوسری جگہوں پر داخلے مل جائیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے دوسرے ممالک سے قابل اساتذہ کو بلایا جائے۔ آخر نصف صدی پہلے تک برصغیر میں اجتہاد ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن جب ہمارے مدارس کی سوچ ہی محدود ہو ان میں خود ہی آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو اور استاد اس بات سے ڈرتا ہو کہ شاگرد کہیں مجھ سے آگے نہ نکل جائے تو پھر ایسے مدارس سے توقعات فضول ہیں۔ وہ معاشرے کو مسائل کے بوجھ سے تو کیا آزاد کراتے ہیں بلکہ خود معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔